خدیجہ مستور

سالِ ولادت: ۱۹۲۷ء **سالِ وفات: ۱۹۸۲ء**

خدیجہ مستور بریلی کے یوسف زئی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ خدیجہ نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں کی فضا علمی و ادبی تھی۔ ان کے والد تہور خان ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ والدہ انور جہاں اس دور کی اچھی شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں سکول میں داخل ہوئیں۔ دو برس بعد والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ کوئی بھائی بھی نہ تھا جو کفالت کرتا لہٰذا تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ خاندان نے کفالت کا ذمہ لینے سے انکار کر دیا تو انھیں اپنے نانا کے پاس جانا پڑا جہاں گھر پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ زندگی دکھوں اور مشکلات سے ہمکنار رہی مگر علمی و ادبی ماحول نے ان کی ڈھارس بندھائے رکھی۔

علم دوستی اور ادب شناسی نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور یوں محنت، لگن اور ذوق وشوق نے ایک حساس شخصیت کو ادیبہ بنا دیا۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ اور زندگی کے تجربات نے انھیں ادب کے قریب کر دیا۔ انھوں نے ان تجربات کو اپنی تحریروں میں سمونا شروع کر دیا۔ ان کی بہن حاجرہ مسرور کی طرف سے بھی ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء سے اپنی نگارشات باقاعدہ طور پر رسائل میں بھیجنا شروع کر دیں۔ ان کی ابتدائی دور کی کہانیاں اپنے وقت کے ادبی رسائل "خیال" اور "عالمگیر" میں شایع ہوئیں۔ جلد ہی ان کا شمار ادیبوں میں ہونے لگا اور ادبی دنیا انھیں اہمیت دینے لگی۔

۱۹۴۵ء میں سید احتشام حسین نے ریڈیو کی نشری تقریر میں خدیجہ کی ایک کہانی کی تعریف کی تو عام قارئین تک ان کا نام پہنچا۔ قارئین نے بھی اس کی تحریروں کو پسند کیا جس نے خدیجہ میں اعتماد، ہمت اور حوصلے کو جلا بخشی۔ ۱۹۵۰ء میں ظہیر بابر سے ان کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد بھی ان کا ادبی ذوق قائم رہا۔ وہ بہت سے رسائل کی مدیر بھی رہیں۔ ہجرت کے بعد ان کا قیام لاہور میں رہا اور یہیں اُن کا انتقال ہوا۔

"بوچھاڑ"، "تھکے ہارے"، "ٹھنڈا میٹھا پانی"، "چند روز اور" اور "کھیل" ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ناول نگاری میں بھی نام پیدا کیا بلکہ ناول نگاری ہی ان کی وجہِ شہرت بنی۔ "زمین" اور "آنگن" ان کے مشہور ناول ہیں۔ "آنگن" پر انھیں آدم جی ادبی انعام ملا۔ "زمین" ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

ان کی تحریروں میں حقیقت نگاری کا فن نمایاں ہے۔ جس نے ان کے فن کو ادب کی دنیا میں ایک وقار اور اعتماد بخش کر اعلیٰ ادیبہ کا درجہ دیا۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، سہا اور محسوس کیا اس کو چھپایا نہیں بلکہ اپنی تحریروں میں سمو دیا۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں تفصیل نگاری اور انسان دوستی کا وصف بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے جزئیات اور تفصیل نگاری کی صلاحیت سے اپنی تحریروں کے ذریعہ زندگی اور معاشرے کے بہت سے مسائل پر بھرپور توجہ دی۔ ان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں بلکہ انھوں نے اپنی زندگی کے تمام تجربات کو اپنی تحریروں میں سمو دیا ہے۔ انھوں نے کردار نگاری پر بھی خصوصی توجہ دی۔ خاص خوبی یہ ہے کہ ان کے کردار تخیلاتی یا ماورائی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے جانے پہچانے کردار ہیں جن کی نفسیات سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ ان کرداروں سے کہانی کا جو تانا بانا وہ بنتی ہیں اس سے ہمارے معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے۔

خدیجہ نے جن کٹھن حالات میں زندگی گزاری، اگر کوئی اور ہوتا تو اس کی تحریروں میں غم واندوہ اور ہاتھوں کو زخمی کرنے والے کانٹے ہوتے، مگر ان کی تحریروں میں محبت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور دل کو چھو لینے والا سوز ملتا ہے، جو ہر اہلِ قلم کے بس کی بات نہیں۔ زبان و بیان پر قدرت، ذخیرۂ الفاظ اور سلیقۂ استعمال نے ان کی تحریروں کو مؤثر بنا دیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی تحریر میں ایک خاص چمک، تیکھا پن اور ہمہ رنگی ملتی ہے جو ان کے کسی ہم عصر کی تحریر میں نظر نہیں آتی۔ گویا انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنی ذہانت اور فنی صلاحیت کا لوہا منوا لیا۔

شاملِ کتاب ناول "آنگن" ان کی وجہِ شہرت بن گیا۔ یہ ناول "تحریکِ پاکستان" کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں ناول کی تمام بنیادی خصوصیات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ ایک خاندان کی کہانی ہے مگر اس کے تمام کردار سیاسی و سماجی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں اور جن کرداروں کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے وہ محض گوشت پوست کے پتلے نہیں بلکہ احساسات و جذبات بھی رکھتے ہیں۔

خدیجہ مستور

آنگن

فساد ختم ہو گئے تھے۔ بس کہیں اکا دکا واردات کی خبر پڑھنے میں آ جاتی۔ اب دونوں ملک بھائی چارہ قائم کرنے پر زور دے رہے تھے۔ عالیہ کو ان خبروں سے ذرا بھی دلچسپی نہ ہوتی۔ بھلا ایسی بھی معصومیت کس کام کی!

خالی وقت گزارنے کے لیے اس نے والٹن کیمپ جانا شروع کر دیا تھا۔ سکول سے آ کر وہ تھوڑی دیر آرام کرتی اور پھر بس سے چلی جاتی۔ وہاں بچوں کو مفت میں پڑھا کر اسے عجیب سا سکون ملتا۔ مصروفیت کی دُھول نے پچھلی یادوں کو دھندلا دیا تھا۔

اماں اس کے والٹن کیمپ جانے کی وجہ سے سخت اُکھڑی اُکھڑی رہتیں۔ جب بھی وہ وہاں سے واپس آتی کوئی نہ کوئی ناخوشگوار بات ہو جاتی۔ ایسے موقع پر وہ چپ رہتی۔ وہ اپنی طرف سے بات نہ بڑھانا چاہتی تھی۔

آج چھ بجے شام جب وہ واپس آئی تو اماں اُجاڑ لان میں کرسی پر بیٹھی جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھیں...... ''تم وہاں کس لیے جاتی ہو؟ تم کو اس بیکار کام میں کیا مل جاتا ہے؟'' انھوں نے سختی سے سوال کیا۔

''سکون ملتا ہے۔'' اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

''وہی باپ اور چچا والی باتیں' کیا اب تم مجھے تباہ کرنا چاہتی ہو؟''

''بچوں کو پڑھانے سے اگر آپ تباہ ہوتی ہیں تو میں مجبور ہوں۔'' اس نے تنگ آ کر جواب دیا۔

''تم مجبور ہو؟'' اماں نے غصے سے پوچھا۔

''ہاں میں مجبور ہوں۔'' وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ اماں پلو میں منہ چھپا کر رو رہی تھیں۔

کمرے میں تنہا پڑ کر وہ دیر تک سوچتی رہی کہ وہ کیا کرے۔ وہ اماں کو خوش نہیں رکھ سکتی' انھیں خوش رکھنے کے لیے اسے اس پرائے گھر میں پڑا رہنا ہوگا۔ تنہائی اور بیکاری میں جو جذبے اسے ستائیں گے، ان سے کس طرح پیچھا چھڑائے گی' اور جو یادوں کے بھوت اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں ان سے بچ کر وہ کہاں بھاگے گی۔ وقت یوں نہیں گزر سکتا' اسے سہارے کی ضرورت ہے اور پھر اس خیال کے ساتھ ہی جانے کیسے اس کو والٹن کیمپ کے ڈاکٹر کا خیال آ گیا۔ اچھا آدمی ہے بیچارہ۔

رات اماں نے اکیلے کھانا کھا لیا۔ اس نے بھی شکایت نہ کی۔

آج جب وہ سکول سے واپس آئی تو اُداس تھی۔ آپ ہی آپ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جی بیٹھا جا رہا ہے۔ سردیاں دم توڑ رہی تھیں پھر بھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے سخت سردی لگ رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ آج وہ آرام کرے گی' آج کہیں نہ جائے گی۔

کھانے کے بعد کمرا بند کر کے وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ کتنی دیر کروٹیں بدلتی رہی مگر نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ اُکتا کر اُس نے اخبار اُٹھا لیا۔ آج تو صبح جانے سے پہلے اُس نے اخبار کو سرسری طور پر بھی نہ دیکھا تھا۔ جی ہی نہ چاہا۔

تین موٹی موٹی سرخیاں دیکھنے کے بعد ایک خبر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں...... مشہور مسلمان کانگرسی لیڈر کو کسی شخص نے مار دیا۔ نہرو کا اظہارِ افسوس' مرحوم کے خاندان کے لیے تین ہزار روپیا کا عطیہ۔ ہندو مسلمان منافرت کی شدید مذمت......

بڑے چچا کا نام پڑھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔ وہ پاگلوں کی طرح اُٹھی اور پھر اپنے بستر پر گر پڑی۔ اسے اپنے دل میں درد سا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ ارے وہ تو بڑے چچا سے مل کر بھی نہ آئی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے ...... وہ اپنے پلنگ کی پٹی سے سر پٹک پٹک کر بڑی دیر تک روتی رہی' اب وہ بڑے چچا سے کبھی نہ مل سکے گی۔ اس احساس نے اسے اس بُری طرح تڑپایا کہ اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکتی تھی۔

شام ہوگئی۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ روتے روتے وہ تھک چکی تھی۔ اماں کئی بار دروازہ کھٹکھٹا کر لوٹ چکی تھیں۔ اس نے سوجی ہوئی آنکھوں کو بہ مشکل کھولا اور کمرے میں بکھرے ہوئے اخبار کے صفحوں کو روندتی باہر نکل گئی۔

''ارے تم کو کیا ہوا ہے؟'' اماں اس کے سرخ چہرے اور سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔

''بڑے چچا کو کسی ہندو نے چپکے سے مار دیا۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔ اتنا رو چکنے کے بعد اسے جیسے صبر آ گیا تھا۔

''ہے ہے' ساری زندگی ہندو کی غلامی کرنے کے بعد یہ بدلہ ملا؟'' اماں کی آواز بھرّا رہی تھی۔ انھوں نے پلّو میں آنسو خشک کر لیے ...... ''ہے بے چاری بڑی بھابی کا کیا حال ہوگا' انھوں نے تو ہم لوگوں کو اطلاع تک نہ دی۔''

عالیہ اماں کو ان کے حال پر چھوڑ کر باہر لان میں چلی آئی ...... بس بڑے چچا! اتنی شاندار زندگی کا یہی انجام ہونا تھا؟ ...... تین ہزار روپے کا عطیہ اور اظہار افسوس؟' پتا نہیں کپڑے کی دکانوں کے لیے بیس پچیس ہزار روپے ملے تھے یا نہیں؟ بجلی کا کنکشن بحال ہوا تھا یا نہیں؟ کیا اسی لالٹین کی پیلی پیلی روشنی میں بڑے چچا کی لاش رکھ کر سب روتے رہے ہوں گے؟ پتا نہیں جمیل بھیا کا کیا حال ہوگا؟ موت نے سارے اختلافات مٹا دیے ہوں گے کہ نہیں؟

رات لیمپ کی روشنی میں میز پر جھکی وہ بڑی دیر تک بڑی چچی کو خط لکھتی رہی اور اماں باتیں کرتی رہیں ...... جانے کیا حال ہوگا بڑی بھابی کا۔ بڑے بھیا مرحوم نے نہ زندگی بھر خود چین لیا نہ دوسروں کو لینے دیا۔ بھرے پرے گھر تباہ کر دیے' کیا مل گیا اُنھیں؟ جن کا ساتھ دیا انھوں نے ہی پردیس میں موت کی نیند سلا دیا۔ ہائے چلے ہی آتے، ان کافروں کے ملک سے۔ بھلا کیا ضرورت تھی وہاں رہنے کی۔ اور اب وہ جمیل میاں ہیں' وہ بھی ویسے ہی شاندار نکلے۔

خط ختم کر کے اس نے لفافے میں بند کر دیا۔

''سو جایئے اماں۔'' وہ لیمپ بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ذرا دیر بعد اماں کے خراٹے لینے کی آواز آنے لگی مگر وہ آنکھیں کھولے اس اندھیرے میں کیا کچھ نہیں دیکھ رہی تھی ...... یہ بڑے چچا کی کفنائی ہوئی لاش یہاں اتنی دور لا کر کون رکھ گیا۔ اسرار میاں تم بڑے چچا کو ہاتھ نہ لگانا' کریمن بوا ناراض ہو جائیں گی۔ کریمن بوا! اتنی زور زور سے قرآن شریف نہ پڑھو' موت کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑے چچا نہیں مرے ایک دُنیا مرگئی' چپکے چپکے پڑھو کریمن بوا۔...... اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں مگر وہ اپنے کانوں کو کیسے بند کر لیتی۔ اتنی دور سے بڑے چچا کے ملک سے کریمن بوا کے قرآن شریف پڑھنے کی آواز برابر آئے جا رہی تھی اور بڑی چچی کے بین کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھی۔

''اے اللہ اس رات کو گزار دے۔'' وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ پھر آخر اسے نیند کیوں نہیں آ رہی' کیسی کیسی غلط کہاوتیں مشہور ہوگئیں اور آج تک کسی نے صحیح نہ کیں۔

صبح وہ اُٹھی تو تھکن اور صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ برآمدے میں دھوپ آ گئی تھی اور اماں مائی کے ساتھ ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

وہ حسبِ معمول سکول جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ اماں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ بھلا اتنے صدمے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ اماں اور مائی کے بے حد اصرار کے باوجود ناشتا کیے بغیر سکول چلی گئی۔

ایک بجے جب وہ سکول سے واپس آئی تو دھوپ میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر خود کو جیسے گرا دیا اور جب مائی نے اس کے سامنے کھانا رکھ دیا تو وہ اس طرح کھانے لگی جیسے کڑوی روٹی نگل رہی ہو۔ اماں اب تک اپنے کام میں مصروف تھیں۔...... ''افوہ سارا دن گزر جاتا ہے مگر کام ختم نہیں ہوتا' کوٹھیوں میں کتنا کام ہوتا ہے' مائی برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں میں پانی ڈال دو۔ سُوکھے جا رہے ہیں''...... اماں برابر بولے جا رہی تھیں...... ''مائی تم نے کمرے میں میز پر کھانا کیوں نہیں لگایا؟ میز کرسی ہو تو آدمی کیا مزے سے کھانا کھاتا ہے' اپنے ہاں کا بھی کیسا بُرا رواج تھا کہ تخت پر بیٹھے کھا رہے ہیں۔''

آج مرے کل دوسرا دن' مرنے والے کو کون روتا ہے۔ آج اماں پر اپنے ہاں کے رواجوں کے عیبوں کا انکشاف ہو رہا تھا۔ اگر یہ کوٹھی نہ ملتی تو پھر یہ اتنے بہت سے راز کیسے کھلتے۔

کھانا کھا کر وہ والٹن کیمپ جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں نے اسے مڑ کر دیکھا اور کوئی اعتراض کیے بغیر پھر کام میں مشغول ہو گئیں۔

(آنگن)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیں۔

i- والٹن کیمپ جانے پر عالیہ کی امّاں کا رویہ کیا ہوتا تھا؟
ii- عالیہ نے اخبار میں کون سی اہم خبر پڑھی تھی؟
iii- بڑے چچا کو کس نے مارا تھا؟
iv- بڑے چچا کے قتل کی خبر پڑھ کر عالیہ کی کیا حالت ہوئی؟

2- سبق کے حوالے سے خالی جگہ پر کریں۔

i- فساد............ ہو گئے تھے۔ (شروع، ختم)
ii- .... نے اکیلے کھانا کھایا۔ (ماں، باپ)
iii- .... لکھ کر اس نے لفافے میں بند کر دیا۔ (مضمون، خط)
iv- بڑے چچا کو کسی .... نے چھُرے سے مار دیا۔ (مسلمان، ہندو)
v- خالی وقت گزارنے کے لیے اُس نے .... جانا شروع کر دیا۔ (والٹن کیمپ، سکول)

3- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

i- مصروفیت کی دھول نے پچھلی یادوں کو دھندلا دیا تھا۔
ii- یادوں کے بھوت اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں۔
iii- جن کا ساتھ دیا انھوں نے ہی موت کی نیند سلا دیا۔
iv- آج مرے کل دوسرا دن۔ مرنے والے کو کون روتا ہے؟

4- آنگن کے حوالے سے عالیہ کے کردار پر بحث کریں۔

5- آنگن کے حوالے سے خدیجہ مستور کے اسلوبِ تحریر پر نوٹ لکھیں۔

6- ''آنگن'' کے کتاب میں شامل اقتباس کا خلاصہ لکھیں۔

7- مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کریں۔

دم توڑنا' موت کی نیند سلانا' کروٹیں بدلنا' جی بیٹھنا۔

☆......☆......☆

مختصر افسانہ

مختصر افسانہ انگریزی اصطلاح (Short Story) کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے لیے بالعموم افسانہ کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی افسانوی صنفِ ادب ہے جس میں کسی خاص کردار، واقعے یا تجربے کے کسی ایک پہلو کو مکمل طور پر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اسے ایک ہی نشست یعنی آدھ گھنٹے سے ایک یا دو گھنٹے میں پڑھا جا سکے۔

ناول نگاری طرح افسانہ نگار کا موضوع بھی زندگی ہوتا ہے لیکن اپنی وسعتوں اور پیچیدگیوں سمیت نہیں بلکہ افسانہ زندگی کے صرف ایک پہلو کی نقاب کشائی کرتا ہے، پوری زندگی کی بجائے صرف ایک گوشے کی جھلک دکھاتا ہے۔ افسانے کی کامیابی کا انحصار موضوع کی عمدگی پر ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کو روزمرہ زندگی سے اپنا موضوع منتخب کرنا چاہیے۔

وحدتِ تاثر مختصر افسانے کی بنیادی شرط ہے۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ افسانہ قاری کے ذہن پر ایک اور صرف ایک اثر چھوڑے جسے نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ کہانی میں دلچسپی کا مرکز ایک اور صرف ایک ہو ورنہ تاثر تقسیم ہو جائے گا اور اس کی شدت میں بھی کمی آ جائے گی۔ وحدتِ تاثر کا، اختصار کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔ مختصر افسانے میں اختصار کے معنی یہ ہیں کہ ایسے تمام واقعات، بیانات، مناظر، مکالمے اور کرداروں کو کہانی میں شامل کرنے سے گریز کیا جائے جو وحدتِ تاثر کی راہ میں حائل ہوں اور قاری کی توجہ کو منتشر کرنے کا باعث بنیں۔ مثال کے طور پر افسانے میں زیادہ کرداروں کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ افسانے کا پلاٹ اور کہانی مختصر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو پورا افسانہ صرف ایک ہی کردار پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی طرح مکالموں میں شاعرانہ تراکیب کے استعمال سے انھیں طوالت دینے کی گنجائش بھی افسانے میں نہیں ہوتی، اس لیے افسانہ نگار چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرتا ہے۔

دلچسپی کا عنصر بھی افسانے میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اگر افسانے کی کہانی یا پلاٹ دلچسپ نہ ہو اور اس میں بھرپور تجسس نہ ہو تو قاری افسانے کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ اسی طرح افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ افسانہ نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے، اُسے نہایت مختصر وقت میں قاری تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اس لیے افسانے میں واقعات کی بھرمار نہیں ہوتی، نہ کرداروں کا تفصیلی مطالعہ ہوتا ہے اور نہ ہی طویل مکالمے ہوتے ہیں۔ گویا ہر پہلو سے ایجاز و اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔

مختصر افسانہ بھی اردو زبان میں انگریزی کے اثر سے آیا۔ منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش نے اردو افسانے کے اولین نمونے پیش کیے۔ علی عباس حسینی، سدرشن اور اعظم کریوی نے پریم چند کی ادبی روایت کو قائم رکھا۔ اس کے بعد حیات اللہ انصاری، سجاد ظہیر، رشیدہ جہاں، اختر حسین رائے پوری اور احمد علی کے علاوہ کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور ممتاز مفتی تقسیم سے قبل افسانے کی دنیا میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے نمایاں افسانہ نگاروں میں اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، غلام الثقلین نقوی، مسعود مفتی، قدرت اللہ شہاب، الطاف فاطمہ، بانو قدسیہ، ہاجرہ مسرور، منشا یاد، انور سجاد، خدیجہ مستور اور جمیلہ ہاشمی وغیرہ شامل ہیں۔